ہوا کے رخ پر چلتی امت اور چراغِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ابدی للکار

تحریر: خواجہ اعجاز مدنی

تاریخ کے آئینے میں جب آج کا مسلمان اپنا چہرہ دیکھتا ہے تو یہ سوال خود بخود ابھر آتا ہے کہ ہم دعووں کے کس مقام پر کھڑے ہیں اور عمل کے کس درجے میں گرے ہوئے ہیں؟ یہ وہ عہد ہے جہاں زبانیں عشقِ رسول ﷺ کے نغمے گاتی ہیں، مجالس اہلِ بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت سے گونجتی ہیں، اور اولیائے کرام علیہ الرحمتہ الرضوان کے اقوال محفلوں کی زینت بنتے ہیں، مگر کردار کی دنیا میں ایک عجیب خلا، ایک خاموش انکار اور ایک بے نام سی منافقت رچی بسی نظر آتی ہے۔ یہ تضاد محض فکری نہیں، بلکہ روحانی دیوالیہ پن کی علامت ہے؛ جہاں ایمان نعرہ بن چکا ہے، تصوف لفاظی میں ڈھل گیا ہے، اور کربلا ایک محفوظ ماضی بن کر رہ گئی ہے، حالانکہ اس کی للکار آج بھی زندہ ہے۔ یہ مضمون اسی زندہ للکار کا محاسبہ ہے ہماری ذات کا، ہمارے معاشرے کا، اور ہماری اُس بے حسی کا جو یزید کو تاریخ میں برا کہہ کر حال میں قبول کر لیتی ہے۔

آج کے مسلمان کی فکری و عملی صورتِ حال ایک نہایت نازک اور گہری معنوی کشمکش کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ زبان پر عشقِ رسول ﷺ کے دعوے، لبوں پر اہلِ بیت، صحابۂ اکرام اور اولیاءِ عظام کی محبت کے نعرے، اور محفلوں میں تصوف و طریقت کے خوش نما تذکرے، مگر جب نگاہ عمل کے آئینے میں ڈالی جائے تو تصویر کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جس نے روح کو رسم میں، باطن کو ظاہر کے فریب میں، اور حقیقت کو محض الفاظ کی آرائش میں مقید کر دیا ہے۔ بزرگانِ دین کی گراں قدر باتوں اور دردمندانہ اقوال کو چن کر، انہیں تقریروں اور تحریروں کی زینت بنایا جاتا ہے، مگر ان اقوال کی روح، ان کے پس منظر کی مجاہدہ آمیز زندگی، اور ان کے اندر پوشیدہ خود احتسابی کا جوہر کہیں نظر نہیں آتا۔ مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ان ارشادات کو اپنی ذات پر منطبق کیا جائے، اپنے نفس کا محاسبہ کیا جائے، یا اپنے کردار کی اصلاح کی جائے؛ بلکہ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ انہی اقوال کی اوٹ میں اپنے آپ کو ایک علمی و روحانی حصار میں محفوظ کر لیا جائے، اور پھر اسی حصار سے دوسروں پر تنقید کے تیر برسائے جائیں۔

یہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ ایک ایسا ذہنی فریب بن جاتا ہے جس میں انسان خود کو عالم، شیخ، صوفی اور صاحبِ حال ثابت کرنے کی خاموش کوشش کرتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ علم کی مشقت، شیخ کی ذمہ داری، صوفی کی انکساری اور صاحبِ حال کی خود سپردگی سے گزرے۔ شریعت، طریقت اور حقیقت کے نام ایسے سہولت پسند انداز میں لیے جاتے ہیں گویا یہ محض چند اصطلاحات ہوں، نہ کہ ایسے راستے جو نفس کی گردن توڑنے، انا کو مٹانے اور دل کو رب کے حضور جھکانے کا تقاضا کرتے ہیں۔ دوسروں پر یہ طعنہ دینا کہ ”اسے شریعت کا علم نہیں، اسے طریقت کا ذوق نہیں، اسے تصوف کا شعور نہیں“ دراصل اپنی ہی داخلی کمزوریوں پر ڈالے گئے دبیز پردے ہوتے ہیں۔ جو شخص خود اپنے اندر کی ویرانی سے خائف ہو، وہی اکثر باہر شور مچاتا ہے؛ جو اپنے باطن کی شکستگی سے واقف ہو، وہ دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کو لازم جانتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ الٹ ہے: خود کو محفوظ رکھنے کے لیے دوسروں کو مشکوک ٹھہرانا، اور اپنے باطن کی خامیوں سے نظریں چرا کر علمی و ادبی لفاظی کے سہارے خود کو دانشور ثابت کرنے کی سعی کرنا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، اور یہ دھوکا سب سے سنگین ہوتا ہے، کیونکہ اس میں انسان خود بھی جانتا ہے کہ اس کی

اصل حیثیت کیا ہے، مگر اس علم کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ نہ وہ عالم ہے جس کا علم عمل میں ڈھلا ہو، نہ وہ شیخ ہے جس کی نظر دلوں کو جوڑتی ہو، نہ وہ صوفی ہے جس کی خاموشی بولتی ہو؛ مگر پھر بھی وہ معیاری الفاظ، کلاسیکی اشعار اور وزنی اصطلاحات کی مدد سے ایک مصنوعی وقار قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کا تقاضا محض نعرہ نہیں، بلکہ اتباع ہے؛ اہلِ بیت وصحابہ اور اولیاء سے محبت کا تقاضا محض تذکرہ نہیں، بلکہ ان کے اخلاق، ان کی دیانت اور ان کی خود احتسابی کو اپنی زندگی میں اتارنا ہے۔ جب تک یہ محبت کردار میں ڈھل نہ جائے، اس وقت تک یہ صرف ایک خوبصورت دعویٰ رہتی ہے، جس کی چمک زبان پر تو ہوتی ہے، مگر دل اور عمل کی دنیا میں اس کا کوئی عکس نہیں پڑتا۔ لہٰذا اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم لفظوں کے سہارے خود کو بڑا ثابت کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنے اندر جھانکیں، اپنے دعووں کو اپنے اعمال کے ترازو میں تولیں، اور یہ تسلیم کریں کہ حقیقی علم، حقیقی تصوف اور حقیقی عشق ہمیشہ انکساری، خاموشی اور خود احتسابی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، نہ کہ شور، تنقید اور خود ساختہ برتری کے دعوؤں کے ساتھ۔

ہم ایک عجیب اور المناک نادانی کے اسیر ہیں۔ واقعۂ کربلا سنہ 61 ہجری میں رونما ہونے والی یزیدیت کو برا بھلا کہنا، یزید، شمر، خولی اور ابن زیاد پر لعنت وطعن کرنا بلاشبہ حق ہے، بلکہ یزیدی فکر سے نفرت رکھنا ایمان کی غیرت کا تقاضا ہے۔ مگر افسوس! ہماری عقل یہاں آ کر ٹھہر جاتی ہے، ہماری فکر یہیں ساکت ہو جاتی ہے۔ ہم اس بنیادی سوال پر غور ہی نہیں کرتے کہ اللہ کے حضور ہمیں اس بات کا جواب دینا نہیں ہے کہ ہم نے ماضی کے یزید کو کیا کہا، بلکہ اس بات کا جواب دینا ہے کہ ہم نے اپنے عہد کے یزیدوں کے ساتھ کیا کیا۔ ہم سے ہرگز یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے یزید کو گالی دی یا نہیں، شمر پر لعنت کی یا خولی اور ابن زیاد پر تبرہ کیا یا نہیں؛ اس لیے کہ ہم سنہ 61 ہجری میں موجود ہی نہیں تھے۔ ہم اس دور کے کرداروں کے مکلف نہیں۔ ہم سے تو سوال ہمارے وقت کے یزید، ہمارے زمانے کے شمر، ہمارے عہد کے ابن زیاد اور خولی کے بارے میں ہوگا، ان طاقتوں، ان نظاموں، ان سیاستوں کے بارے میں، جن کے ساتھ ہم شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں، جن کے دسترخوان پر بیٹھے ہیں، جن کے جھنڈے اٹھائے پھر رہے ہیں، اور جن کی زیادتیوں کو ہم نے مصلحت کے خوش نما نام دے کر جائز ٹھہرا رکھا ہے۔

جو یزید اور اس کے حامی نبوت سے چند دہائیوں بعد اقتدار کی ہوس میں دین داری بھول بیٹھے تھے، ہم پندرہ سو برس بعد کس منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کاش ہم اس وقت ہوتے تو حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہوتے؟ ہم سے تو اپنے وقت کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور سچ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ ہم ایک عظیم غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بدترین اعمال کے باوجود بھی ہم پکے سچے مسلمان ہیں، اور گزرے ہوئے یزیدیوں کو گالیاں دے کر خود کو امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عاشق سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہ خود فریبی ہے، محض خود فریبی۔

آج کی سیاسی جماعتوں اور یزیدی کی سیاست میں اگر کوئی بال برابر فرق واضح کر دے تو واقعی وہ انعام کا مُستحق ہے۔ ہم موجودہ سیاسی جماعتوں کے ساتھ سینہ تان کر چلتے ہیں، اور گزرے ہوئے یزید کو کوستے ہیں، کیا کبھی ہم نے اپنے اس دوغلے کردار پر بھی غور کیا؟ یزید کی سیاست سے کہیں زیادہ خطرناک آج کی یزیدی فکر ہے۔ آج بھی حسینیت صدائے حق بلند کر رہی ہے، آج بھی "ھل من ناصر ینصرنا" کی صدا فضا میں موجود

ہے، مگر ہم کتنے منافق ہیں کہ زبان پر حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ہے اور عمل میں یزیدی فکر رکھنے والی سیاسی جماعتوں کے چمچے بنے ہوئے ہیں۔ اور پھر شرم وحیا کے بجائے ہم مصلحت، حکمت اور خود ساختہ تاویلات کی دبیز چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

اگر اسلام کا نام یہی ہے کہ ہر ناجائز کام کو "**مصلحت**" کے نام پر انجام دے دیا جائے، تو پھر یہ بلند آہنگ فلسفے، یہ اخلاقی خطبے، یہ فکری دعوے آخر کس لیے؟ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ستر ستر برس کی عمریں بیت جاتی ہیں اور مسلمان کو آج تک مزاجِ شریعت اور مزاجِ قرآن کا صحیح شعور نصیب نہیں ہوتا، بس باتیں، باتیں اور باتیں۔ یزید آج بھی موجود ہے، شمر بھی ہے، ابن زیاد بھی ہے، خولی بھی ہے۔ دوسری جانب امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دیا ہوا نعرہ آج بھی زندہ ہے۔ مگر ہم اتنے مکار ہو چکے ہیں کہ نوکری کا بہانہ، روزی روٹی کا بہانہ، گاڑی بنگلہ کا بہانہ تراش کر حق سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ ذرا یہ بات دل نشین کر لیجیے کہ عشق کے راستے میں سب سے پہلے لذتیں ترک کرنی پڑتی ہیں؛ تب کہیں جا کر مزاجِ حُر سمجھ میں آتا ہے۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ زبان کے مزے بھی لو، شاہی لباس بھی پہنو، مرغِ مسلم دسترخوان پر سجا ہو، بلند و بالا کوٹھیاں بھی تعمیر کرو، اور یزید وقت سے مراسم بھی رکھو کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے، اور پھر دعویٰ عشق بھی! واہ رے مسلمان! عشق کا لذتوں سے کیا واسطہ؟ عشق تو قربانی مانگتا ہے، بے خوفی مانگتا ہے، سچ کے سامنے ڈٹ جانا مانگتا ہے۔

اور جب اس طرح کی باتیں سامنے رکھی جائیں تو فوراً شریعت کا سہارا لیا جاتا ہے: یہ کھانا سنت ہے، یہ پہننا سنت ہے، یہ جائز ہے، یہ ناجائز ہے۔ ارے بھائی! جب دین کو تم نے اپنی ناقص عقل سے سمجھا ہے تو سوال تو کھڑا کرو گے ہی۔ کیا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ شریعت سے ناواقف تھے کہ حج کے موسم میں مکہ چھوڑ کر کربلا کا رخ کیا، جب لوگ مکہ کی طرف جا رہے تھے اور وہ کربلا کی سمت چل نکلے؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایک آیت، ایک حدیث، کسی صوفی کا ایک قول اور دو چار اشعار جمع کر کے اپنا خود ساختہ عقیدہ گھڑ لیا ہے، اور بس اسی دائرے میں گھومتے رہتے ہو۔ اور اگر کوئی تمہیں سچ بات کہہ دے تو فوراً کہہ اٹھتے ہو: اب یہ ہمیں دین سکھائیں گے؟ کمال تو یہ ہے کہ تمہیں اس راستے کا ذرا برابر بھی علم نہیں، تم محض خود کو دھوکا دے رہے ہو۔

یزیدیت تمہارے سامنے کھڑی ہے، مگر تم منافقت اور بزدلی کو مصلحت اور حکمت کا نام دے کر بے غیرتی کا آٹا کھائے جا رہے ہو، اور تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ حقیقت میں ہو کیا، اور دکھا کیا رہے ہو۔ دنیا کی تاریخ اگر غور و فکر کی آنکھ سے پڑھی جائے تو ایک سادہ مگر گہرا اصول سامنے آتا ہے: دنیا عموماً ہوا کا رخ دیکھ کر چلتی ہے۔ جس سمت سے اقتدار کی آندھی اٹھے، جس طرف سے منفعت کی نسیم چلے، اکثر قدم وہیں اٹھتے ہیں۔ یہ وہی دنیا ہے جو موسم کی تبدیلی کے ساتھ لباس بدل لیتی ہے، جو وقت کے تقاضوں کے نام پر اصولوں کی قربانی کو حکمت کہتی ہے، اور جو مفاد کے سامنے صداقت کو بھی تاویلوں کی نذر کر دیتی ہے۔

مگر ہوا خود مختار نہیں۔ قرآنِ حکیم کا اسلوب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کائنات کی ہر حرکت ایک اعلیٰ تر مشیت کے تابع ہے۔ ہوائیں بھی چلتی ہیں تو حکمِ ربانی کے تحت، اور ان کی سمتیں بھی ان ہستیوں کے مزاجِ حق کے تابع ہو جاتی ہیں جنہیں اللہ نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا۔ نبیوں کے مزاج کے سامنے ہوا بھی سر جھکا دیتی ہے، کیونکہ وہاں خواہش نہیں، وحی بولتی ہے؛ وہاں مفاد نہیں، امانت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس

کے برعکس تاریخ کے اوراق ان لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں ابنُ الوقت کہا جا سکتا ہے، وہ لوگ جو وقت کے پجاری ہوتے ہیں، جو لفافے کی چمک میں ضمیر کی آواز کو دبا دیتے ہیں، جو خوشامد کو دانائی اور مصلحت کو دیانت کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو چڑھتے سورج کو سلام کرتا ہے، جو بادشاہ کو پیر اور حاکم کو معبود سمجھ کر ان کے سامنے جھک جاتا ہے۔ ان کی نگاہ میں حق وہی ہے جو طاقت کے ایوانوں سے صادر ہو، اور باطل وہی ہے جو کمزور کے ہونٹوں سے ادا ہو۔ یوں آج کا منظر نامہ یہ بتاتا ہے کہ تقریباً ہر شخص ہوا کے رخ پر چلنے کا عادی ہو چکا ہے۔ مخالفتِ ہوا کی جرأت گویا ناپید ہے۔ ضمیر نے مصلحت کا لباس پہن لیا ہے، اور صداقت نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ہوا کدھر چل رہی ہے، سوال یہ ہے کہ کون ہے جو اس کے سامنے کھڑا ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے؟ اسی سوال کا جواب تاریخ نے کربلا کے میدان میں رقم کیا۔ جب ہر سمت سے ہوا یزیدیت کے حق میں چل رہی تھی، جب تخت، لشکر، خزانے اور فتوے ایک ہی صف میں کھڑے تھے، تب ایک چراغ روشن ہوا۔ ایسا چراغ جس نے آندھی کو للکارا، جس نے تاریکی کے سینے میں نور کی لکیر کھینچ دی۔ وہ کون تھا؟ وہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا لعل تھا۔ وہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیٹا تھا۔ وہ کملی والے ﷺ کا نواسہ تھا۔ وہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا، حق کا نام، صداقت کی پہچان، اور باطل کے مقابل استقامت کی ابدی مثال۔

حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہوا کے رخ کو نہیں دیکھا، حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حق کا رخ دیکھا۔ انہوں نے تعداد نہیں دیکھی، معیار دیکھا۔ انہوں نے انجام نہیں دیکھا، انجام ساز اصول دیکھا۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کون ساتھ ہے، بلکہ یہ دیکھا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ کربلا میں حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ چراغ کی ذمہ داری یہ نہیں کہ آندھی سے مفاہمت کرے، بلکہ یہ ہے کہ اپنی لو کو قائم رکھے، خواہ اس کی قیمت لہو کیوں نہ ہو۔ اسی لیے حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ محض ایک تاریخی کردار نہیں، بلکہ ایک فکری معیار ہیں۔ وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ زمانہ اگر ابنُ الوقت بن جائے تو مؤمن کا فرض ہے کہ وہ ابنُ حق بنے۔ وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ خوشامد وقتی کامیابی تو دے سکتی ہے، مگر عزتِ ابدی صرف استقامت سے ملتی ہے۔ وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ حق کا چراغ اگر ایک بار دل میں روشن ہو جائے تو ہوا کی کوئی آندھی اسے بجھا نہیں سکتی۔ پس آج بھی سوال وہی ہے: ہم ہوا کے رخ پر چلنے والوں میں ہیں یا چراغِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وارثوں میں؟ جواب ہمارے نعروں میں نہیں، ہمارے کردار میں لکھا جائے گا۔ آج سوال یہ نہیں کہ ہم حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کتنا یاد کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہم حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کتنا جیتے ہیں۔ یزید کو برا کہہ دینا آسان ہے، مگر یزید وقت کے سامنے کھڑے ہونا حوصلہ مانگتا ہے۔ کربلا تاریخ کا باب نہیں، بلکہ ہر دور کا معیار ہے، ور ہر شخص کو اپنے ضمیر کے کربلا میں یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس صف میں کھڑا ہے۔ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں یہ نہیں سکھایا کہ طاقت کے سامنے خاموش رہا جائے، بلکہ یہ بتایا کہ جب حق اکیلا بھی رہ جائے تو اس کا ساتھ دینا ایمان کی معراج ہے۔ آج بھی ہوا کا رخ طاقت، مفاد اور مصلحت کی طرف ہے، مگر چراغِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ آج بھی جل رہا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہم ہوا کے غلام بنیں گے یا چراغ کے وارث؟ یاد رکھیے! حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ نعروں سے نہیں، قربانی سے ثابت ہوتا ہے۔ اور جو حق کے سامنے کھڑا ہونا سیکھ لے، وہی تاریخ میں زندہ رہتا ہے۔